1149.

نغمۂ روح

قطعات، غزلیات اور نظموں کا مجموعہ

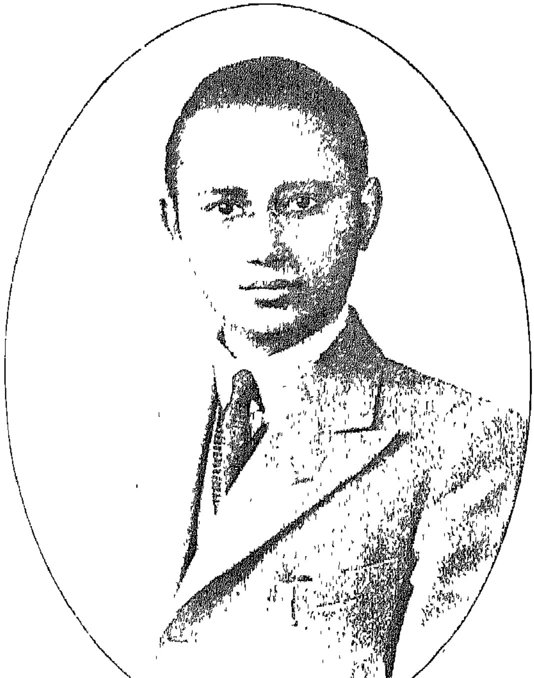
از

اختر انصاری بی، اے (آنرز) دہلوی

اصغر انصاری نے شائع کیا

مطبوعہ دلّی پرنٹنگ ورکس دہلی

۱۹۳۳ء — قیمت ۱۲؍



اختر انصاری

فہرست مطالب

تعارف

تعارف

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی جائنٹ اڈیٹر ادبی دنیا لاہور

آج کل مجموعہ شائع کرانے کی جو وبا عام ہے اُس سے خوف زدہ ہوکر کسی مجموعہ کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مستحقِ اشاعت ہے یا نہیں۔ لیکن اختر انصاری کا مجموعہ ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق کم از کم میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُسے ضرور اور جلد از جلد شائع ہو جانا چاہیئے تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اختر صاحب اپنے احباب کے اصرار سے مجبور ہوکر اپنی نظموں کو کتابی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔

اختر صاحب اور اُن کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اُن کی نظمیں اکثر "ادبی دنیا" کے صفحات پر زینت افروز ہوتی رہی ہیں۔ وہ خود موجودہ دور کے نوجوان شعرا میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اور دنیائے ادب اُن کے صحیح ذوقِ شعری سے بخوبی واقف ہے۔

اختر صاحب کے متعلق یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اُنھوں نے شعر میں جتنی پختگی بھی حاصل کی ہے وہ اُن کی تنہا ذاتی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ انہوں نے عام رسم کے مطابق کبھی کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ اور ان کا ذوقِ شعری کسی خارجی رہبری کا شرمندۂ احسان نہیں ہوا۔ اختر صاحب کی طبیعت بچپن ہی سے ایک لطیف اور شاعرانہ غمگینی اور سوز پسندی اپنے میں پنہاں رکھتی ہے۔ وہ طفلی میں بھی اپنے جذبات کا اظہار منظوم زبان میں کر لیا

کرتے تھے لیکن جب انہیں اُردو اور فارسی پر عبور حاصل ہوگیا تو وہ گویا ایک چھائی ہوئی گھٹا کی طرح برس پڑے اور اب بائیس سال کی عمر میں وہ اس قدر پاکیزہ اور بلند شعر کہہ لیتے ہیں کہ اُن کی شاعری کے مستقبل کے متعلق سوائے حیرت آمیز خاموشی کے اور کوئی چیز پیش نہیں کی جا سکتی۔

اختر صاحب بی۔ اے آنرز ہیں اور تعلیمی سلسلے میں انگلستان ہو آئے ہیں لیکن "انگریزی تعلیم" اور "ولایت" کے الفاظ جس خشکی اور بے رنگی کو اپنے دامن میں لئے ہوتے ہیں اُس سے اختر صاحب بہت بُعد رکھتے ہیں۔ وہ شعر کہتے وقت ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر لمحہ میں ایک حسّاس شاعر ہیں۔ اور دنیا کا ذرہ ذرہ اُن کے لئے اپنے اندر ایک جہانِ حسن چھپائے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اس آزادروی اور سلامتِ طبع کا ثبوت اپنے لباس، اپنی گفتگو اور طرزِ زندگی سے دیتے رہتے ہیں۔ ہندوستان کے مغرب زدہ نوجوان طبقہ کے خلاف وہ ہمیشہ مشرقی بانکپن کو اپنے لئے مایۂ ناز سمجھتے ہیں۔

میں اپنے عزیز دوست کو "نغمۂ روح" کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اُن کا یہ حسین و جمیل مجموعہ مقبولیت عام حاصل کرے۔

مقدمه

ڈ

تبصرہ

انیس احمد رشدی ایم۔اے دہلوی

شاعری فطرت کی زبان ہی، لیکن وہ زمانہ اور ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انسان کے بنیادی جذبات اور عنصری عواطف ناقابلِ تبدّل ہیں۔ تاہم اپنے مظاہر کے اعتبار سے وہ نت نئی صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں غم و غصہ، حُزن و ملال، سوز و گداز، مسرّت و فرحت، ترحّم و شفقت اور اسی قسم کے دوسرے نفسانی انفعالات اپنی ماہیت کے اعتبار سے ایک ہوتے ہوئے بھی وقت اور محل کے سانچوں میں ڈھل کر مختلف شکلیں پیدا کرتے ہیں۔ افریقہ کے وحشی جن جذبات کا احساس کرتے ہیں وہ متمدن دنیا میں بسنے والے انسانوں کے جذبات سے اصولاً مختلف نہیں ہوتے۔ لیکن مظاہر کے اختلاف نے اس درجہ بیگانگی پیدا کردی ہے کہ بظاہر کوئی حدِ مشترک نظر نہیں آتی۔ اسی طرح خود متمدن دنیا کی وہ صدیاں جب انسان جہالت کے گہوارہ میں تھا موجودہ زمانے سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں ہمارے آبا و اجداد جس انداز سے اپنے جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے وہ ہمارے طریقۂ تعبیر سے اتنا ہی بُعد رکھتا ہے جتنا آسمان زمین سے۔ پھر اگر یہ درست ہے کہ شاعری کا سب سے بڑا موضوع انسانی احساسات اور انفعالات کی تفسیر ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زمانہ کی رفتار

اور گرد وپیش کے تغیر سے جو اثر اُن احساسات اور انفعالات پر ہوگا اُس کا شاعری میں منعکس ہونا ضروری ہے۔

اردو کی شاعری بھی اور زبانوں کی شاعری کی طرح مختلف دوروں میں منقسم ہوتی ہے اور ہر دور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دوسرے دوروں سے ممتاز ہے۔ ولی کا عصر میر کے عصر سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا میر کا عصر غالب کے عصر سے۔ بدقسمتی سے ابتک اردو زبان و ادب کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں اُن میں یہ نکتہ قابل لحاظ نہیں سمجھا گیا کہ زبان کی تدریجی ترقی کے علاوہ ادب و تاریخ کا وہ ازلی تعلق جو ہر جگہ پایا جاتا ہے دکھانا بھی مورخ کا ضروری فرض ہے۔ ولی کا دور میر کے دور سے نہ صرف اسلئے ممتاز تھا کہ اردو نے من حیث اللسان ابھی وہ شگفتگی حاصل نہیں کی تھی جو میر کے عصر میں اُسے نصیب ہوئی۔ بلکہ اسلئے بھی کہ تاریخ نے ابھی وہ منازل طے نہیں کئے تھے جو بعد میں طے ہوئے۔ ہر دور کی ادبی خصوصیات اُس دور کے تاریخی پس منظر کے ساتھ ملا کر اگر دیکھی جائیں تو ادب کا حقیقی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

اردو شاعری کا ارتقا انہی خطوط پر ہوا جن کی ناموس قدرت مقتضی تھی۔ مگر سب سے زیادہ نمایاں اثر جس چیز کا ہوا وہ مغربی تسلط ہے۔ یہ درست ہے کہ اردو اپنے موجودہ دور نہضت میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی تقریبا تمام زبانوں سے خوشہ چینی کر رہی ہے۔ مگر مغرب نے علی العموم اور انگریزی نے علی الخصوص سب سے زیادہ اُسکا خزانہ مالا مال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مختصر سے مقدمہ میں اشارتاً بھی اُن اثرات کا ذکر نہیں کیا جا سکتا جو قریب قریب ایک صدی سے

مغرب کا ادب اردو پر ڈال رہا ہے۔ لیکن میں ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ خاص اردو شاعری پر انگریزی شاعری کے اثر سے متعلق چند جملے کہوں۔

انگریزی شاعری اردو شاعری سے صرف اوزان و بحور کے نظام میں ہی مختلف نہیں بلکہ موضوعِ شعر کے اعتبار سے بھی بالکل جداگانہ چیز ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو بالارادہ انگریزی کے تتبع میں شعر کہنے کے عادی ہیں اس ضروری نکتہ کو اکثر فراموش کر دیتے ہیں۔ مصرعوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ منظوم کر دینا، قوافی میں ذرا آزادی سے کام لینا، معمولی بحروں میں قافیہ کو اڑا کر نتیجہ کو بلینک ورس سمجھنا یا بالجملہ قدیم عروض کے سخت قوانین میں قدرے سہولت پیدا کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ انگریزی شاعری میں جو واقعیت ہے۔ جو سلامت ہے، جو تنوع ہے اس کو بھی منتقل کیا جائے۔ لیکن اس کے برخلاف اکثر حالات میں نئے سکول کے شعرا صرف ظاہری تبدیلیوں پر اکتفا کرتے ہوئے حقیقی روح سے دور ہو جاتے ہیں۔ آزاد اور حالی نے جو طرز قائم کی تھی اس کا مدعا یہ ہرگز نہیں تھا کہ آیندہ شعرا ایسی نظمیں لکھا کریں جیسے سکول کے لڑکے مضامین لکھا کرتے ہیں۔ برسات کے مناظر پر، صبح و شام پر، بہتے پانی پر، اونچے پہاڑوں پر آپکو ہزاروں نظمیں ملینگی لیکن یہ اکثر اسی قدر خام اور مضحکہ خیز ہونگی جتنا ان عنوانوں پر کسی بچے کا مضمون۔ اسکی وجہ حقیقت میں یہ ہے کہ یہ شعرا عام طور پر مغربی شاعری سے اتنے ہی نابلد ہوتے ہیں جتنا ایک مولوی۔ فرق صرف یہ ہے کہ مولوی اپنی ناواقفیت کو سمجھتا ہوا در پروا نہیں کرتا مگر یہ لوگ مغربی ادب کی نہیں بلکہ اس چیز کی جسے وہ مغربی ادب کہتے ہیں اتباع کرنا اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ مگر انہیں کیا

معلوم کہ مغرب کا شیلے اور ورڈس ورتھ فطرت سے کچھ ایسے انداز کا عشق رکھتا ہے جو ان مشرقی شاعروں کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُسکا وصف (Description) ہمارے شعرا کے وصف کی طرح بے روح اور بے رنگ نہیں ہوتا۔

اسکے علاوہ اردو شاعری کا بڑا حصہ محض غنائی (Lyrical) ہے کبھی غزل اور کبھی قصیدہ کی شکل میں کبھی قطعہ اور کبھی رباعی کی صورت میں یہی غنائی عنصر بار بار نظر کے سامنے آتا ہے۔ کاش اردو کے شعرا یہ جانتے کہ اُنکی طرح مغرب میں شاعر ہمیشہ دیوانہ نہیں رہتا۔ بلکہ اکثر وہ ایسی حکیمانہ اور فکر انگیز باتیں کہتا ہے جو سننے والوں کو جذبات کے عالم سے غور کی دنیا میں لیجاتی ہیں۔ اردو کا شاعر جب شعر کہتا ہے تو اُسکے سینے میں ایک آگ جل رہی ہوتی ہے اور شعر اس کے منہ سے چنگاریاں بنکر جھڑتے ہیں لیکن بالعموم مغربی شاعر جب شعر کہتا ہے تو اُسکا سینہ ایک ایسے نور کا مخزن ہوتا ہے جو چاندنی کی طرح ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ایک مغربی نقاد نے عبرانی شاعروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے شعروں میں اس قدر سوز، اسقدر قوت اور اسقدر رعنائی ہوتی ہے کہ اُنہیں پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جنگل میں آگ لگ رہی ہو۔ یہ خصوصیت مشرقی شاعری کی ایک عام خصوصیت ہے۔ اردو سے جو مشرق میں انگریزی سے قریب ترین واسطہ رکھتی ہے بہر حال توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ مغربی اثرات سے اعتدال حاصل کریگی۔ لیکن شاذ و نادر حالات کے سوا یہ طوفان اتنا عالمگیر ہے کہ شاعر روائی (Narrative) اور وصفی (Descriptive) قسموں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے بغیر تمام عمر اپنی رام کہانی سناتا رہتا ہے اور نہیں تھکتا۔

میرا مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ انگریزی شاعری کا اثر اردو شاعری پر ابھی زیادہ گہرا

نہیں ہؤا۔ محض سطحی اور قشری تبدیلیاں ہمارے شاعروں نے پیدا کی ہیں جو حالی اور آزاد کے زمانے ہیں نہ صرف جائز بلکہ قابل صد ستائیش تھیں۔ اسلئے کہ وہ ابتدائی تھیں ـــــ اب ضرورت ہو کہ قدم آگے اُٹھایا جائے۔ اردو شاعری کے عیوب یعنی حدود کی تنگی، مشاہدہ کا فقدان، جوش کی زیادتی، تصنع، لفاظی وغیرہ سے احتراز کیا جائے۔

اختر اس عام اثر سے محفوظ نہیں ہیں۔ اُن کے اشعار میں بھی یہ چیزیں پائی جاتی ہیں سب سے پہلے قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ اختر کے حدود شاعری غیر معمولی طور پر تنگ ہیں۔ غنائی شاعری اردو کا جوہر سہی" لیکن نہ اس قدر" پورے دیوان میں سے اگر اس غنائی عنصر کو نکال دیا جائے تو چند صفحوں کا مواد رہ جاتا ہو۔ اختر اپنی طبیعت کے لحاظ سے بہت پُر جوش انسان ہیں۔ اور بعض اوقات اُن کا جوش غیر معمولی طغیانیاں پیدا کر لیتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ بڑی حد تک خود پرست بھی ہیں۔ مغرور اور خود پرست کا باریک فرق میں آپ پر چھوڑتا ہوں ـــــ ظاہر ہے کہ ایسی طبیعت کا انسان سوائے غنائی شاعری کے اور کیا لکھ سکتا ہے۔ یہ چیز اُن کے مجموعہ میں مختلف رنگوں میں نظر آتی ہو۔ قطعوں سے لیکر بڑی سے بڑی نظم میں اس کے آثار موجود ہیں۔ حتیٰ کہ اختر کی وصفیہ نظمیں بھی اس عنصر سے خالی نہیں ہیں مثلاً "فصل بہار" میں بہار کے کیف آفریں مناظر کا ذکر کرنیکے بعد نظم ختم نہیں ہو جاتی بلکہ شاعر آپ کو بہار کا لطف دکھانیکے بعد مُصر ہے کہ آپ خود اُسکے دل کو بھی ایک نظر دیکھ لیں

یہ بادہ ریز موسم گدگداتا ہو میرے دل کو ✣ فسانے عہد ماضی کے سناتا ہو مرے دل کو

"سیر کوہسار" ایک نہایت مرصّع طویل نظم ہے اور یکسر وصفیہ، لیکن آخری بند میں کوہسار کی جگہ خود شاعر اپنے جملہ حزن و ملال کو لئے ہوئے موجود ہے اور کہہ رہا ہے شعر

ایک عالم ہو غریق رنگ و بوئے کوہسار ✣ اور افکار پریشاں میں رہوں میں بیقرار

مثالوں کی ضرورت نہیں ہے پورے مجموعہ میں قطعوں سے قطع نظر —— کہ وہ تاج والے قطعے کے علاوہ یکسر غنائی ہیں —— کوئی نظم بھی ایسی نہیں جہاں شاعر اور اس کا دل نہ پایا جائے۔

مشاہدہ کی غلطیاں اختر کے کلام میں نمایاں نہیں ہیں۔ مگر اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ اختر نے اپنی کسی نظم میں اس بات کی کوشش نہیں کی ہے کہ وہ کسی منظر کو بیان کرتے ہوئے مشاہدہ کے ایسے چھوٹے چھوٹے نقوش چھوڑ جائیں جنکا مجموعی اثر ایک واقعیت سی پیدا کر دے۔ وہ شیلے کی طرح مادی چیزوں کا موازنہ غیر مادی چیزوں سے کرنے کے عادی ہیں وہ محسوس چیزوں کو غیر محسوس چیزوں کیساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ اور اگرچہ یہ کوئی عیب نہیں تاہم اسکا اعتدال سے گذر جانا بدنما معلوم ہوتا ہے۔ وصفیہ نظموں کی حقیقی خوبی یہ ہے کہ وہ چیزیں جو انسانی نظر دیکھ سکتی ہے سادگی سے بیان کر دی جائیں مگر اس طرح کہ شاعر کی باریک بینی کی داد دئے بغیر نہ رہا جائے۔ اس قسم کی چیزیں اختر کے ہاں کم ہیں۔ وہ عام طور پر سادہ جزئیات ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور ان میں بھی بعض اوقات ان سے لغزش ہو جاتی ہے مثلاً "سوتیا کی تیز لپٹیں اور جوہی کی مہک" یا "کوہ پر شبنم کا ہر قطرہ دُرِ نایاب ہے" کہیں کہیں وہ اسقدر پیش پا افتادہ جزئیات کا انتخاب کرتے ہیں کہ شعر کا تمام اثر غارت ہو جاتا ہے مثلاً "برسات کے مناظر" میں کہتے ہیں شعر

دشت اور میدان ہرے ہیں، وادیاں شاداب ہیں، جاری ہیں فوارے ہر سُو، موجزن تالاب ہیں" دوسرا مصرع خصوصاً بہت پھیکا ہے "سیر کوہسار" میں کہتے ہیں شعر

یہ مناظر کی دلاویزی، یہ کیفِ صبح و شام + فطرتِ معصوم کی ہے کارفرمائی تمام

یا پھر غزل میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ۔ کہتے ہیں شعر

شب مہتاب میں فطرت حسین معلوم ہوتی ہو ٭ خموشی اک سرود دلنشیں معلوم ہوتی ہو

لیکن جیسا میں نے ابھی کہا ہے اُن کی حقیقی خصوصیت مادی کا غیر مادی اور محسوس کا غیر محسوس کے ساتھ ملانا ہے۔ اسی چیز نے شیلے کی شاعری کو سراب صفت (Elusive) اور اسی نے اختر کی شاعری کو فریب کار (Sensual) بنایا ہے۔ چند مثالیں دیتا ہوں کہ صحیح طور پر یہ خصوصیت سمجھ میں آجائے۔ ایک نظم میں کہتے ہیں۔ شعر

وہ پھدکتی ننھی چڑیوں کے سحر زا چہچہے
یا فضا میں آسمانی دیویوں کے قہقہے

چڑیاں بہت معمولی پرندوں میں سے ہیں اور صرف پہلا مصرع کوئی خاص اثر پیدا نہ کرتا لیکن دوسرے مصرع نے شعر میں جان ڈالدی۔ اور شعر کو اختر کے خاص رنگ میں رنگ دیا۔ ایک قطعے میں کہتے ہیں۔

"اُٹھی ہے درد کے مانند کالی کالی گھٹا"

یہاں یہ خصوصیت بالکل واضح ہے۔ دوسرا شاعر درد کو گھٹا سے تشبیہ دیتا لیکن اختر نے گھٹا کو درد سے تشبیہ دی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے قطعے میں کہتے ہیں۔

"سکوت بن کے فضاؤں پہ چھا گئی ہو گھٹا"

اس میں بھی مادی چیز کو غیر مادی چیز سے تشبیہ دی ہے "سیر کوہسار" کے مندرجہ ذیل اشعار اس مخصوص رنگ کی بہت عمدہ مثالیں ہیں۔

(۱) ابر کے ٹکڑوں کا اُٹھنا وادیوں سے کبھی

اور چھا جانا فضاؤں پر بہ رنگِ خامشی

(۲) پھول کی رنگین کشش سے یوں کھنچا جاتا ہے دل

مائلِ رفعت ہو جیسے کوئی روحِ منفعل

(۳) یا مگر کچھ شوخ پریاں تتلیوں کے بھیس میں

آگئی ہیں سیر کرنے آدمی کے دیس میں

"ابر کے چھانے" کی تشبیہ "خاموشی" کے ساتھ "تتلیوں" کی تشبیہ "پریوں" کے ساتھ اور سب سے زیادہ دوسرے شعر کی بے مثل تشبیہ ایسی مثالیں ہیں جن کے بعد اور مثالوں کی ضرورت نہیں رہتی۔

جوش کی ضرورت سے زیادہ فراوانی، جو اردو شاعری کا ایک عام عیب ہے اختر کے ہاں بھی ہے۔ وہ موضوعِ شعر اور قوتِ شعر میں توازن قائم نہیں رکھ سکتے۔ یہ چیز اختر کے کلام ہی میں نہیں بلکہ بڑے بڑے شعرا کے کلام میں موجود ہے۔ شوق قدوائی کی مثنوی "عالمِ خیال" میں جب بیوی اپنے سفر پر گئے ہوئے شوہر کی غیر موجودگی کے اثرات کو ظاہر کرتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی موت کا نوحہ کر رہی ہے۔ اس قسم کی چیزیں اختر کے ہاں بہت ہیں، وہ جذبات میں بہ جاتے ہیں۔ اور تناسب کو برقرار نہیں رکھ سکتے میں صرف ایک مثال دوں گا۔ اُن کی نظم "شام" میں یہ چیز بہت بُری معلوم ہوتی ہے "ہو گئی اب بزم سونی رو رہی ہیں ڈالیاں" اور

"فکر میں ہے غرق اُجڑی گود والا آسماں" اور

"ماتمی جوڑے میں ہے ملبوس ساری کائنات"

جیسے مصرعوں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر خزاں کا ذکر کر رہا ہے اور رخصتِ بہار کا سوگ منا رہا ہے حالانکہ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ ایک شام کو سورج دوسری صبح پھر نکل آنے کے لئے چھُپ گیا ہے اور فطرت آرام کی نیند سو رہی ہے۔ مگر یہی بے اختیاری جب صحیح موضوع پا لیتی ہے تو پھر وہ زورِ کلام بن جاتی ہے۔ مثلاً اختر کی نظم "عالمِ اضطراب میں" جو اس خصوصیت کی حامل ہے اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ خصوصاً ایسے مصرعے "ہائے کیوں جی چاہتا ہے خوب رو لے کے لئے" یا

"درد کے ہاتھوں لٹا جاتا ہوں کیونکر لکا سکوں" یا

"درد کیوں رہ رہ کے اُٹھتا ہے جگر میں اے خدا"

ہلالِ عید میں بھی یہی جوش زورِ کلام بن گیا ہے۔ کس قدر پُر جوش شعر ہے۔

خدا نے پھیر لیں آنکھیں وفا کہیں نہ رہی

فلک فلک نہ رہا اور زمیں زمیں نہ رہی

"غمِ محبت" بھی اسی جوش اور سادگی کی وجہ سے بے پناہ چیز بن گئی ہے۔

اردو شاعری کی تنگیٔ حدود کی طرف میں ابھی اشارہ کر چکا ہوں۔ اسی قلّتِ مضامین نے ایک دوسرا عیب پیدا کیا یعنی لفّاظی۔ جب شاعر ایک ہی چیز کو بار بار پیش کرتا ہے تو فطری طور پر اسکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کم از کم طرزِ ادا انوکھی ہو۔ رفتہ رفتہ اسکی تمام توجہ زبان پر مبذول ہو جاتی ہے۔ اور وہ شاعرانہ احساس جو شعر کی جان ہے اُسکے اشعار میں سے مفقود ہو جاتا ہے مضامین ناکارہ ہوتے ہیں لیکن الفاظ نہایت پُر شوکت۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

سامع اِس تصنّع سے اُکتا جاتا ہے اور شعر کا اثر کلیتہً خطابت کا ممنون ہوکر رہ جاتا ہے۔ یہ تصنّع اور لفاظی آج کل کے نوجوان شعرا میں بہت پائی جاتی ہے۔ آختر بھی بعض جگہ اِس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ''آمدِ بہار'' اور ''ہنگامۂ خیال'' کا بیشتر حصہ محض لفظوں کا طلسم معلوم ہوتا ہے۔ اسیطرح ''صلائے شاعر'' پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جوش پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ مثلاً مندرجۂ ذیل اشعار کا تصنّع جن میں سے بعض بہت بلند نظموں کے اشعار ہیں ناقابلِ انکار ہے:-

(۱) غبارِ سینۂ محزوں کو دھو نہیں سکتی
یہ آنکھ اشک کی لڑیاں پرو نہیں سکتی

(۲) سینے کے داغ کو اب لیلائے بزم کردے
شمعِ غیورِ دل کو رسوائے بزم کردے

بہرحال یہ وہ عیوب ہیں جو آختر کی شاعری ہی میں نہیں بلکہ اردو شاعری کے متوسط درجے میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کبھی آختر بھی اِن عیوب سے پاک ہوکر حقیقی شعرا کی اوّلین صف میں جگہ پاسکیں، لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ موجودہ حالت سے قطع نظر کرلی جائے۔

ایک اور چیز بھی لایقِ توجہ ہے۔ آختر کے کلام میں اثر اور بندش کے اعتبار سے ہمواری نہیں ہوتی۔ سادہ ترین مصرعوں سے لیکر دقیق ترین شعروں تک ہر قسم کے نمونے اُن کے مجموعہ میں موجود ہیں۔ بعض اوقات وہ نہایت بلند مصرعے کہہ جاتے ہیں لیکن فوراً ہی اسکے بعد ایسے مصرعے لکھدیتے ہیں

جو پہلے مصرعوں کا اثر زائل کر دیتے ہیں مثلاً آپ رواں میں کہتے ہیں:۔

راہ میں آرام لینے کی قسم کھائی ہو کیا + گردشِ پیہم کی آخر علتِ غائی ہے کیا
توڑ بھی دے اب قسم کو پیچھے مڑ کر دیکھ لے + اپنی صدیوں کی کمائی کو گھڑی بھر دیکھ لے
سچ بتا کس کی تمنا میں پھرا کرتا ہے تو + کس کی خاطر یوں پہاڑوں سے گرا کرتا ہے تو

ان اشعار کی بے ساختگی اور پختگی بندش قابلِ داد ہے۔ لیکن اسی نظم میں ایسے پھیکے مصرعے بھی موجود ہیں مصرع

"وقفِ تدریسِ جنوں اپنا دل مغرور کر"

اسی طرح "وعالمِ اضطراب میں" جس کا ذکر میں زورِ بیان کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ یہ عیب موجود ہے۔ ذیل کے دونوں مصرعوں کو ملائیے اور دیکھئے کہ بے ساختگی اور تصنع کا کیسا عجیب اتحاد ہے۔ شعر

کیوں ہوا جاتا ہے باطل ضبطِ گریہ کا فسوں
درد کے ہاتھوں لُٹا جاتا ہے کیوں لب کا سکوں

اختر کا حقیقی جوہر اُن کے قطعوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ رباعی نما شعر جن کو وہ قطعوں کا عنوان دیتے ہیں اُن کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ یہ قطعے رباعی سے اس خاص باب میں مختلف ہیں کہ اول الذکر میں بیشتر پہلے تین مصرعے چوتھے مصرعے کی خاطر برداشت کر لئے جاتے ہیں۔ لیکن ان قطعوں میں وہ پہلے تین مصرعے بھی اُس فضا کے پیدا کرنے کے کام آتے ہیں جو چوتھے مصرعے کے ساتھ مکمل ہو جاتی ہے۔ ان قطعوں میں وہ خامیاں نہیں پائی جاتیں جو بڑی نظموں میں موجود ہیں۔ اختر کے ہاں تسلسلِ خیال کم پایا جاتا ہے۔

وہ ایک بسیط اور منفرد خیال کو نہایت سلیقہ کے ساتھ ادا کرنے کا صحیح ملکہ رکھتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پختگی آنے کے ساتھ ساتھ وہ تسلسلِ خیال پر بھی قادر ہو جائیں گے۔ اور اُن کی طویل نظموں کی ناہمواری دُور ہوتی جائے گی۔ اِن کی نظم "امنگ" جو اس مجموعہ میں شامل ہے دکھاتی ہے کہ اگر مشق اور کوشش جاری رہی۔ تو یقیناً بہت جلد اختر کے کلام میں انتہائی برجستگی، چُستی اور صفائی پیدا ہو جائے گی۔ ذیل کا قطعہ بھی جو اس مجموعہ میں شامل نہیں اس بات کی ضمانت ہے:-

آرزوئیں نہ رہیں حسرت و ارماں نہ رہے
یعنی پہلو سے مرے وہ دلِ شیدا نہ گیا
چُھٹ گئے اور سب اندازِ جنوں تو لیکن
دوسرے تیسرے دن کا مرا رونا نہ گیا

اختر کا انتخابِ الفاظ بھی بعض اوقات ناقص ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خامی نوشتقی کا لازمہ ہے۔ دل کی دنیا کا پہلا مصرع

"پَو پھٹی، اک شور برپا ہو گیا"

اور چوتھا شعر اسی ناقص بندشِ الفاظ کی مثالیں ہیں "آمدِ بہار" کا آخری مصرع

"میرے باغِ آرزو کو جگمگا جائے بہار"

پر دہ دری کر رہا ہے کہ وقت پر صحیح لفظ نہ ملنے پر شاعر محض استعارہ پہ قناعت کر کے رہ گیا۔ "شام" کا یہ مصرع

"آہ اک وہ وقت تھا جب ہر طرف تھی کھیلی"

اور "ہنگامۂ خیال" کا یہ مصرع

"شمعِ غیورِ دل کو رسوائے بزم کر دے"

اور "برسات کے مناظر" کا یہ شعر

"کوئی دیکھے اِن کے سینوں میں اُمنگوں کی بہار"
پھولتی پھلتی تمناؤں ترنگوں کی بہار!

پڑھیئے اور اندازہ لگائیے کہ شاعر نے "کھیلی"۔ "غیور" اور "ترنگوں" کا کیا مفہوم لیا ہے۔ "لہلہاتی ہوئی آواز" "دل کا ہلتا ہوا جام" اور "تلاطمِ انجم" بظاہر استعارے ہیں لیکن حقیقت میں مجبوری کے پردے۔ اسی طرح بعض اوقات وہ محاورے کی غلطیاں بھی کر جاتے ہیں۔ مثلاً

(۱) کھیلتی ہیں باغ میں پھولوں سے پھولوں والیاں
جا بجا جھولے پڑے ہیں خوش ہیں جھولوں والیاں

(۲) بہارِ خلد کا سینے میں بول بالا ہے
تری ضیا سے مری روح میں اُجالا ہے

(۳) کس کو لیں آغوش میں کر لیں تو رخصت ہوگئیں
کیا ہوا دریا کی موجیں ہیں اگر اندوہگیں ؟

(۴) اِن کی بن آئی ہوا اُڑتے ہیں قطاریں باندھ کر
اب تو لاتے ہیں پرندے آسمانوں کی خبر

اِس مجموعہ کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ اختر نے اپنی قوتِ شعری کا بڑا

حصہ "بہار" اور "نغمہ" کی نذر کردیا ہے "نغمۂ روح" کے صفحات تین چوتھائی کے قریب اِن ہی دو عنوانوں سے مملو ہیں۔ نغمہ کے اثرات کو اختر نے مختلف اسالیب سے بیان کیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ بعض اوقات بہت بانکی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اسیطرح بہار کے متعلق اُن کے قطعات اور نظموں میں مختلف قسموں کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں۔ اور جس ذوق کے ساتھ اختر نے اُن کو ظاہر کیا ہے اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ حقیقت میں بہار سے محبت رکھتے ہیں اور اُس سے حظ اندوز ہوتے ہیں۔

مگر یہ لُطف دائمی نہیں ہوتا۔ اُن کی متالّم طبیعت ہمیشہ آخر میں انہیں مغموم کر دیتی ہے۔ اختر ایک متشائم (Pessimist) انسان ہیں۔ اور اُن کی شاعری سے یہ چیز ظاہر ہے۔ مثالوں کی ضرورت نہیں اسلئے کہ قریب قریب ہر نظم میں اس کے آثار موجود ہیں۔ مگر ایک نکتہ لائق بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ اختر اُن متشائمین میں سے نہیں ہیں جو دنیا کو مسرت سے خالی اور حُسن سے معرا سمجھتے ہیں۔ اُن کو پورا احساس ہے کہ اُن کے اردگرد چاروں طرف قہقہوں اور جلووں کا طوفان بپا ہے۔ لیکن چونکہ وہ خود مسرور نہیں ہیں۔ اسلئے دوسروں کی مسرت سے انہیں ایک گونہ تکلیف ہوتی ہے۔ شیلے کی مشہور نظم "ایک سوال" (a question) بھی اُسکی یہی خصوصیت ظاہر کرتی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ شیلے کی طرح دوسرا رُخ بھی اُن کی شاعری میں موجود ہے۔ یعنی دونوں کا اندوہ و ملال بعض اوقات زندگی کے روشن پہلو سے مغلوب ہو جاتا ہے۔

شیلے نے کہا ہے:-

If winter comes, can Spring be far behind.

اختر کہتے ہیں۔

(۱) مجھے ناکامیِ پیہم سے مایوسی نہیں ہوتی
ابھی امید میری نوجوان معلوم ہوتی ہے

(۲) مژدہ اے مغموم! غم کی انتہا ہونیکو ہے
یہ مرض حد سے گذر کر اب دوا ہونیکو ہے

اگر موسم بہار کے مناظر اختر کو بھولے ہوئے فسانے یاد دلاکر مغموم کرتے ہیں تو بعض اوقات اُن کے لئے سرمایہ مسرت بھی بن جاتے ہیں۔ اور پھر وہ بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں:-

تجلیات مسرت سے قلب ہے معمور ✦ مگر بہار کسی کا سلام لائی ہے
تجھے بھی علم ہے اے موسم بہار کہ تو ✦ کسی کے نام مرا نامہ محبت ہے

اختر کی شاعری کسی مخصوص عقیدے کا مظہر یا کسی ایک نظریہ کی توضیح نہیں ہے۔ وہ کیٹس (Keats) کی طرح شاعری کا مقصد صرف تلاش حُسن سمجھتے ہیں۔ اور بس ظاہر ہے کہ ہر شخص اس مقصد سے مطمئن نہیں ہوسکتا لیکن میرے نزدیک یہ اس قدر بُرا نہیں ہے جسقدر کسی مصنوعی خودساختہ عقیدے کی بےمحل تفسیر

اختر کی شاعری اچھی ہو یا بُری، خلوص سے محروم نہیں۔ اختر جو محسوس کرتے ہیں اُسی کو منظوم کرتے ہیں۔ اُن کے عقیدۂ شعری اور زندگی میں تضاد نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ مبالغہ کے اُن عیوب سے جو اسقدر عام ہیں وہ محفوظ ہیں۔ اور کبھی

کبھی تو وہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو چٹکیوں کا اثر رکھتی ہیں۔ مثلاً "ضبطِ اشک" یا "دردِ بے درماں" یا "جفائے آرزو" کے اشعار۔ اُن کی غزلیں بھی نظموں اور قطعوں کی طرح اُن کے اصلی جذبات کا آئینہ ہوتی ہیں۔ دیکھئے ان اشعار میں کتنا عمق ہے۔

کوئی جب نالہ کرتا ہے کلیجہ تھام لیتا ہوں + فغانِ غیر بھی اپنی فغاں معلوم ہوتی ہے
اگر اشکوں سے بھی کوئی نہ سمجھے مدعا اُن کا + تو اس سے آگے ہیں مجبور میری بے زباں آنکھیں
آرزو کو روح میں غم بن کے رہنا آ گیا + سہتے سہتے ہم کو آخر رنج سہنا آ گیا

اختر کا مجموعہ ندرتِ ادا کی مثالوں سے بھی خالی نہیں ہے خصوصاً اُن کے قطعات کہ وہ بہت مختصر اور نہایت پُرزور ہوتے ہیں۔ مثلاً "مغنیہ کی آواز" یا "نغمۂ دل" یا "شبِ پُربہار"۔ اُن کی نظم "مغنیہ" سادگی اور چستی کے لحاظ سے بے مثل ہے خصوصاً آخری شعر

وہ بات تو نہیں مگر اب بھی مغنیہ! + کھاتا ہے دل قسم تری شیریں لبی کی

ذیل کے اشعار بھی ندرتِ ادا کا نمونہ ہیں:۔

شرابِ ناب کی غارتگری ہوش، ارے توبہ + زمیں بھی مائلِ عرشِ بریں معلوم ہوتی ہے
آئینۂ نگاہ میں عکسِ شباب ہے + دنیا سمجھ رہی ہے کہ آنکھوں میں خواب ہے
سب کی قسمت پلٹا کھاتی ہے کبھی تو ہاں بجا + زندگی کیونکر گذارے گر ذرا بھی شک ہے

نظم "امنگ" میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں۔ خصوصاً یہ مصرع۔ "مرے دماغ میں انگڑائیوں کا عالم ہے"

میں تبصرہ ختم کرنے سے پہلے دو چیزوں کی معذرت کرنا چاہتا ہوں پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے قصداً اختر کے عیوبِ شاعری پر زیادہ زور دیا۔ صفائی میں میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ بہر حال دوست کی نکتہ چینی دشمن کے طعنوں سے کم تلخ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں تبصرہ میں توازن قائم نہ رکھ سکا لیکن کم از کم میں مطمئن ہوں کہ دو گھنٹے کی قلیل فرصت میں جو اختر صاحب نے مقدمہ لکھنے کے لئے مجھے دے میں اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتا تھا +

۹۴ء

نغمۂ رُوح

آمدِ بہار

نزہتِ فصلِ بہاری عیش کی بنیاد ہے
محفلِ گُلشن سزاوارِ مبارکباد ہے

کونسا دل ہے جواب مجبورِ ہے ناشاد ہے
بُلبُلِ فریاد کش بیگانۂ فریاد ہے

داستانِ قیس ہے افسانۂ فرہاد ہے
پتے پتے کی زباں پر عشق کی رُوداد ہے

پنجۂ شاہینِ وحشت سے چمن آزاد ہے
تھا جو ویرانہ کبھی اب عندلیب آباد ہے

میرے دل کی اُجڑی دنیا میں بھی آجائے بہار
میرے باغِ آرزو کو جگمگا جائے بہار

ضبطِ اشک

اِن آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا مَیں نے
کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
مَیں اِن کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی
پہنچ کے قلب میں بنجاتینگے یہ انگارے

دِل کی دُنیا

پَو پھٹی، اک شور برپا ہوگیا! — جاگ اُٹھّی کائناتِ خوابگیں
عشقِ محزوں ہوگیا شوریدہ سر — لے گئی شب دُور اشکِ شبنمیں
سازِ دل صرفِ نوا سنجی ہوا — کھو گئی لے میں فغانِ آتشیں
ہو گئے سب یک بیک نغمہ سرا — کوہساروں اور درختوں کے مکیں
گُل نے سینہ چاک کرکے رکھ دیا — بُلبُلیں مصروفِ نغمہ ہوگئیں
ننھّی کلیوں نے نمائش کے لئے — دی اُلٹ اپنی نقابِ عنبریں
ہر شگوفے کی حیا پرور چٹک — بن گئی موجِ ترنّم کی امیں
موجِ گستاخِ صبا کی چھیڑ پر — آبِ ساکن ہوگیا چیں بر جبیں
ذرّہ ذرّہ ہوگیا آفاق کا — چشمہ زارِ نغمہ ہائے دلنشیں
کوہ پیما زمزموں سے گونج اُٹھی — آسمانوں کی فضائے نیلمیں

آہ! میرے بربطِ دل کو ملا
ایک نالہ جس میں گویائی نہیں

غزل

آرزو کو رُوح میں غم بن کے رہنا آگیا
سہتے سہتے ہم کو آخر رنج سہنا آگیا

دِل کا خوں آنکھوں میں کھنچ آیا، چلو اچھا ہُوا
میری آنکھوں کو مرا احوال کہنا آگیا

سہل ہو جائے گی مشکل ضبطِ سوزِ عشق کی
خونِ دل کو آنکھ سے جس روز بہنا آگیا

مَیں کسی سے اپنے دل کی بات کچھ کہتا نہ تھا
اَب سخن کی آڑ میں کیا کچھ نہ کہنا آگیا

جب سے مُنہ کو لگ گئی اختر محبت کی شراب
بے پیے آٹھوں پہر مدہوش رہنا آگیا

حسین مُطربہ

(ایک تصویر کو دیکھکر)

لبوں میں رس، شراب آنکھوں میں، عارض میں شعاعِ مہر
تبسّم میں سرودِ جانفزا کا راز ملتا ہے
تری تصویر یکسر جنّت نظّارہ ہے لیکن
نگاہیں کس طرح دیکھیں کہ دل کا جام ہلتا ہے

بانسری

یہ تری دلدوز تانیں پے بہ پے!
ہو گیا ہوں خود بخود سرشارِ مے
کیا سُنانا چاہتی ہے دل کو تُو
یہ صدا نغمہ ہے یا فریاد ہے؟

فصلِ بہار

خُمار آگیں ہوا، اُودی گھٹائیں، ہلکی ہلکی پھوار،
سہانا دن ہے، فرطِ شوق سے طائر چہکتے ہیں
سرود و رقص کی محفل سجی ہے سبز پیڑوں پر
خوشی سے جھومتی ہیں ٹہنیاں پتّے لہکتے ہیں
چمن میں ڈھیر ہے ہر سمت لاکھوں سُرخ پھولوں کا
کسی آتشکدہ میں جیسے انگارے دہکتے ہیں
وہ سبزہ زار جن میں فصلِ گُل ہنگامہ آرا ہے
گُلوں کی مست کرنے والی خوشبو سے مہکتے ہیں
عجب عالم ہے اس رنگین سمے میں مے پرستوں کا
نہیں حاجت شرابِ ناب کی، یونہی بہکتے ہیں
یہ بادہ ریز موسم گُدگُداتا ہے مرے دل کو
فسانے عہدِ ماضی کے سُناتا ہے مرے دل کو

کنارِ جمنا

سُہانی رات، ہَوائیں، کنارۂ دریا

ضیا فگن ہے قمر، موجِ آب نغمہ ریز

جو کیفیت ہے مری آہ کیا بیاں کروں

دل و جگر مترنّم ہیں، رُوح سجدہ ریز

شام

ہو چکی دن کی حکومت، شام جلوہ ریز ہے
اَب دُھندلکے کا سماں یکسر سکوت انگیز ہے
پھیکی پھیکی روشنی ہے رفعتِ افلاک پر
اور ظلمت چھائی جاتی ہے جبینِ خاک پر
اوڑھ لی ہے سارے عالم نے ردائے سُرمگیں
کیا بھلی معلوم ہوتی ہے فضائے سُرمگیں
وادیِ مغرب میں جا کر سو گیا ہے آفتاب
یعنی ہم آغوشِ منزل ہو گیا ہے آفتاب
اب فلک سے بارشیں انوار کی ہوتی نہیں
اس جہان کے رہنے والوں میں شعاعیں بٹ چکیں

ماتمی جوڑے میں ہے ملبوس ساری کائنات
آہ! سورج کے رُخِ تاباں کی ماری کائنات
چھا گیا ہے بزمِ قدرت پر اُداسی کا سماں
فکر میں ہے غرق اُجڑی گود والا آسماں
کس کو لیں آغوش میں، کرنیں تو رخصت ہو گئیں
کیا ہوا دریا کی موجیں ہیں اگر اندوہ گیں!
اب کہاں وہ خوش ادائی، اب کہاں وہ تازگی
بیل بوٹوں سے چمن کے چھن گئی ہے زندگی
سب پرندے چہچہا کر گھونسلوں میں چھپ گئے
آخری نغمے سُنا کر گھونسلوں میں چھپ گئے
نغمۂ مرغانِ خوش الحاں سے اب محروم ہیں
پیڑ اپنے مُطربوں کی یاد میں مغموم ہیں
ختم ب دن بھر مست ہو ہو کر بجائیں تالیاں
ہو گئی اب بزم سُونی، رو رہی ہیں ڈالیاں
آہ! اک وہ وقت تھا جب ہر طرف تھی کھلبلی
بُوٹے بُوٹے میں مسرّت، ہر کلی میں بے کلی

جب ہوا کے تیز جھونکوں میں بھری تھیں شوخیاں
تھیں غزل خواں بلبلیں اور جھومتی تھیں ٹہنیاں
جگمگاتے تھے شعاعوں سے زمین و آسماں
اِک گلستاں کیا، بہار آباد تھا سارا جہاں
اک گھڑی یہ ہے کہ ساری انجمن افسردہ ہے
سرنگوں ہے پتّہ پتّہ، ہر کلی پژمردہ ہے

غزل

چیر کر سینے کو رکھدے گر نہ پائے غمگسار

دل کی باتیں دل سے ہی کوئی بیاں کبتک کرے

ہائے یہ داغِ محبّت کی نرالی اک جفا

قصّۂ غم ہو کسی کا، میرا دل دھک دھک کرے

سب کی قسمت پلٹا کھاتی ہی کبھی تو، ہاں بجا

زندگی کیونکر گزارے، گر ذرا بھی شک کرے

مَحبّت

مَحبّت ہے اِک خوشنما، شوخ کانٹا
جو چُبھتا ہے آنکھوں کے پردوں میں پہلے،
اُتر جاتا ہے پھر وہ دل کی رگوں میں
خلش اوّل، اور بعد میں درد بن کے

تاج

(چاندنی رات میں)

چاندنی رات کا سماں، تاج کا منظر حسیں،
چھائی ہوئی ہیں مستیاں، کیفیتوں کا دور ہے
قُلزمِ نُورِ چاندنی، کشتیٔ نُور تاج گنج،
نُور میں نُور مل گیا، تاج نہیں کچھ اور ہے

نغمۂ شام

شام، تنہائی، دُھندلکا اور سکوت
باغ میں غمگین ہے ہر ایک شئے
کُنجِ گُل سے آ رہی ہے اک صدا
نالہ زا ہے کُل فضا میں جس کی لَے
بے زباں طائر کا نغمہ ہے، مگر
گوشِ دل کے واسطے افسانہ ہے

مغنّیہ

نغموں کی نذر ہوگیا پہلے ہی جوشِ دل
کیا داد دُوں مغنّیہ! نغمہ سرائی کی

افسوس کیا وہ دل پہ کہ دل دل نہیں رہا
گویا کوئی ادا تھی یہ رنگیں نوائی کی

آواز لہلہاتی ہوئی اور فرح بار،
جسمیں بھری تھیں نزہتیں ساری خدائی کی

اللہ! یاد ہے مجھے اب تک وہ کیفیت
جب دل سے آرہی تھیں صدائیں ہائی کی

وہ بات تو نہیں مگر اب بھی مغنّیہ!
کھاتا ہے دل قسم تری شیریں نوائی کی

ہنگامۂ خیال

اختر تری خموشی گو ہے شکیب ساماں
لیکن تری نظر سے ہے غمّازِ سوزِ پنہاں
چھائی ہوئی ہیں دل پر کالی گھٹائیں غم کی
سینہ بنا ہوا ہے گہوارۂ تجلّی
کچھ جوش زن ہیں نغمے کچھ مضطرب ہیں نالے
اِک بیقرار دنیا پنہاں ہے دل میں تیرے
حدِّ جنوں کو پہنچا ذوقِ نیاز تیرا
لیکن کبھی زباں پر اِک حرف تک نہ آیا
ہے مختصر فسانہ شاعر کی زندگی کا
اوروں کے غم میں گھُلنا، وقفِ نیاز رہنا
لیکن یہ تیرا سودا اب ضبط کا ہو شاکی

لازم ہے اب رہائی زندانیِ بلا کی
لیلائے آرزو ہے خواہانِ بے نقابی
اس تنگ محملی سے بہتر ہے بے حجابی
ضبطِ فغاں سے دل میں اک آگ سی لگی ہے
اس حفظِ غم کو تو نے سمجھا ہے زندگی ہے؟
گو جل چکا ہے سینہ، ساکت ہیں پھر بھی نالے
خود دار کیوں ہے اتنا در پردہ جلنے والے
کیوں پردۂ صدف میں اک گوہرِ تپاں ہے
کیوں منہ نہیں دکھاتا، کیوں غافل زیاں ہے

وہ نالہ ہی نہیں جو لب سے نہ آشنا ہو
وہ بھی کوئی شرر ہے جو سنگ میں چھپا ہو
غافل! ربابِ دل کو مضراب آشنا کر
خاموش شورشوں کو ہنگامہ زا کر

سینہ کے داغ کو اب لیلائے بزم کردے
شمع غیورِ دل کو رسوائے بزم کردے
کب تک ہو سوزِ دل کی دل پر ہی شعلہ باری
ہے لطف جب کہ محفل ہو جائے گرم ساری
جلتا ہے آپ ہی کیا، کُل بزم کو جلا دے
تا یکی اُفق تک اِس آگ کو بڑھا دے
ہو تیرا داغ روشن مثلِ چراغِ ساغر
خورشید بن کے چمکے ملّت کے آسماں پر
ہاں آہِ نارسا بھی تیری جنوں چکاں ہو
عشق و وفا کی مے میں ڈوبی ہوئی فغاں ہو
اغیار کو جلا دے تیرے جگر کی حدّت
تجھ سے رواج پائے پھر آتشیں محبّت

لازم ہے اب رہائی زندانِ بلا کی
لیلائے آرزو ہے خواہانِ بے نقابی
اس تنگ محملی سے بہتر ہے بے حجابی
ضبطِ فغاں سے دل میں اک آگ سی لگی ہے
اس خفظِ غم کو تو نے سمجھا ہے زندگی ہے؟
گو جل چکا ہے سینہ، ساکت ہیں پھر نالے
خوددار کیوں ہے اتنا در پردہ جلنے والے
کیوں پردۂ صدف میں اک گوہر تپاں ہے
کیوں منھ نہیں دکھاتا، کیوں غافل زیاں ہے
وہ نالہ ہی نہیں جو لب سے نہ آشنا ہو
وہ بھی کوئی شرر ہے جو سنگ میں چھپا ہو
غافل! ربابِ دل کو مضراب آشنا کر
خاموش شورشوں کو ہنگامہ نوا کر

سینہ کے داغ کو اب لیلائے بزم کر دے
شمعِ غیورِ دل کو رسوائے بزم کر دے
کب تک ہو سوزِ دل کی دل پر ہی شعلہ باری
ہے لطف جب کہ محفل ہو جائے گرم ساری
جلتا ہے آپ ہی کیا، کُل بزم کو جلا دے
تاریکیِ اُفق تک اِس آگ کو بڑھا دے
ہو تیرا داغ روشن مثلِ چراغِ ساغر
خورشید بن کے چمکے ملّت کے آسماں پر
ہاں آہِ نارسا بھی تیری جنوں چکاں ہو
عشق و وفا کی مے میں ڈوبی ہوئی فغاں ہو
اغیار کو جلا دے تیرے جگر کی حدّت
تجھ سے رواج پائے پھر آتشیں محبّت

شبِ پُر بہار

اندھیری رات، خموشی، سُرور کا عالم
بھری ہے قہر کی مستی ہوا کے جھونکو ں میں
سکُوت بنکے فضاؤں پہ چھا گئی ہے گھٹا
برس رہی ہیں خدا جانے کیوں مری آنکھیں

دردِ بے درماں

میرے اللہ! اب کیا کروں میں!

صورتِ زیست کوئی نہیں ہے

پہلے جیتا تھا جل جل کے، لیکن

اب مزا سوزمیں بھی نہیں ہے

جفائے آرزو

وہ کانٹا کہ تھا مجھ کو پیغامِ عشق
مِرے دل میں پائی جگہ ، رہ گیا

مِرا خونِ دل تو لیا سارا چُوس
مگر خود چُبھا کا چُبھا رہ گیا

غزل

حیات انساں کی سرتا پا زیاں معلوم ہوتی ہے
یہ دنیا انقلاب آسماں معلوم ہوتی ہے

مکدر ہے خزاں کے خوف سے عیش بہار گل
خزاں کی رت بہار بے خزاں معلوم ہوتی ہے

مجھے ناکامیٔ پیہم سے مایوسی نہیں ہوتی
ابھی امید میری نوجواں معلوم ہوتی ہے

کوئی جب نالہ کرتا ہے، کلیجہ تھام لیتا ہوں
فغانِ غیر بھی اپنی فغاں معلوم ہوتی ہے

کمالِ درد و غم دیکھو، صدائے سازِ عشرت بھی
اتر جاتی ہے جب دل میں فغاں معلوم ہوتی ہے

چمن میں عندلیب زار کی فریاد اے اختر
دلِ ناداں کو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

آبِ رواں

فکر میں ڈوبا ہوا پھرتا ہے صبح و شام تو
جھیلتا ہے کیسے کیسے رنج اور آلام تو
جھاڑیاں پُر خار ہیں اور گھاٹیاں ہیں سنگدل
تیری ہمت سے مگر سختیِ رہ بھی ہے خجل
راہ میں آرام لینے کی قسم کھائی ہے کیا؟
گردشِ پیہم کی آخر علّتِ غائی ہے کیا؟
توڑ بھی دے اب قسم کو، پیچھے مُڑ کر دیکھ لے
اپنی صدیوں کی کمائی کو گھڑی بھر دیکھ لے

سچ بتا کس کی تمنّا میں پھرا کرتا ہے تو؟
کس کی خاطر یوں پہاڑوں سے گرا کرتا ہے تو؟
کون سا مُضمر ہے تجھ میں درد، مجھ کو بھی سُنا
توڑ دے مُہرِ خموشی، داستاں اپنی سُنا
وقفِ تدریسِ جنوں اپنا دلِ مغرور کر!
میرا سینہ عشق کے اسرار سے معمور کر!
تو ہے سرگرداں ازل سے، دشت پیمانہ ترا
مضمر اس صحرا نوردی میں ہے افسانہ ترا
تیری ہستی چشمِ دریا بار ہے شام و سحر
یا کسی ناشاد کا بہتا ہوا خونِ جگر؟
چال میں کچھ شوق اور کچھ شوق میں دیوانگی

ہے جنوں انگیز کیسی اُف تری شوریدگی
حسرتِ رفتار میں ہے اِک ترنّم بھی نہاں
ہے یہی نغمہ ترا، بیشک یہی تیری فغاں
آہ! یہ افتادگی اور ایسا موسیقی نواز
ساز وہ رکھتا ہے جو مضراب سے ہو بے نیاز
کس قیامت کا بھرا ہے سوز تیرے ساز میں
بجلیاں کیسی تڑپتی ہیں نوائے راز میں
اے خوشا وہ وقت تو جب تک یونہی ناکام ہے
تیرا جینا بس اِسی آوارگی کا نام ہے

نغمۂ دل

دم تو لے، او گانے والے! دم تو لے
میرا دل بھی گا رہا ہے، سُننے دے
تیرا نغمہ بن گیا مضراب، آہ
بول اُٹھے تارِ دل کے ساز کے

صلائے شاعر

شاعر! رموزِ ہستی کا بار سہنے والے!
سوز و گداز سے ہم آغوش رہنے والے!
گو سوزشِ جگر کو محفل ترس رہی ہے
تیرے سرشکِ خوں سے آتش برس رہی ہے
ہے بے بہا یہ دولت، کیوں اِس کو کھو رہا ہے
کیوں بحرِ اشک میں یہ کشتی ڈبو رہا ہے
سینہ کو چاک کرکے اپنی جلن دکھا دے
بیگانۂ الم کو زخمِ کہن دکھا دے
اب قوم کا تنفّس محتاج ہے تپش کا
تیری جلن سے اس میں چنگاریاں ہوں پیدا

اس طرح تیرا نالہ سینہ سے باہر آئے
ملت کے جسم و جاں میں بجلی سی دوڑ جائے
ہے انجمن فسردہ، تو شعلہ کار ہو جا
اجسادِ بے حسی میں روحِ شرار ہو جا
اعلانِ رازِ دل میں تو منہمک ہو ایسا
ہو جائے محو دل سے اندوہ کا فسانہ
ہاں آئی تیری باری، سرگرمِ زمزمہ ہو
یوں گا نئے ترانے، اک شور پھر بپا ہو
وہ سحر کار نغمہ جو رُوح کو جگا ئے
ہر دل کو گُدگُدائے، ذوقِ عمل بڑھائے

رات اور نغمہ

سکوتِ شب میں فضا چشمہ زارِ نغمہ ہے
چمک ستاروں کی آئینہ دارِ نغمہ ہے
سرشکِ خوں ہیں رواں آہ میری آنکھوں سے
یہ آنسوؤں کی جھڑی آبشارِ نغمہ ہے

غمِ محبّت

غمِ محبّتِ ناکام دل پہ بھاری ہے
مذاقِ درد بھی بیزارِ صبر کاری ہے
سکون نصیب نہیں، ہائے بیقراری ہے
عذابِ روح ہیں آرزو ہماری ہے
کسی کی چاہ اذیّت کا نام ہے گویا
ہمارے واسطے جینا حرام ہے گویا
غبارِ سینۂ محزوں کو دھو نہیں سکتی
یہ آنکھ اشک کی لڑیاں پرو نہیں سکتی
امیدِ یاس کے پہلو میں سو نہیں سکتی

کہ انتہا بھی اذیت کی ہو نہیں سکتی
اگر نہ حسرتِ دل نت نئے ستم ڈھائے
یہ اضطرابِ محبت سکون بن جائے

جفائے رازِ محبت کو سہہ نہیں سکتے
کہ بھید عشق کے سینہ میں رہ نہیں سکتے
ستم تو یہ ہے کہ غیروں سے کہہ نہیں سکتے
کسی کے سامنے دو اشک بہہ نہیں سکتے

کہانی دل ہی کی دل سے کہی نہیں جاتی
یہ آئے دن کی مصیبت سہی نہیں جاتی

نہیں مجال کہ اظہارِ مدعا کریں
حدیثِ درد سے لب اپنے آشنا کریں

سرِ نیاز جھکالیں اور التجا کرلیں
تمام جور کا دل کھول کر گلا کرلیں

کسی کو چیر کے سینہ دکھا نہیں سکتے
یہ حسرتوں کا خزینہ دکھا نہیں سکتے

اب آرزو ہے متاعِ الم لُٹا ڈالوں
جہاں کو نغمۂ آہ و فغاں سُنا ڈالوں

جو داغ دل میں فروزاں ہیں وہ دکھا ڈالوں
جو خُو ہے ضبط کی مجھ میں اُسے مٹا ڈالوں

کروں میں شکوہ نوائی سے راز کو رُسوا
وفا کو، عشق کو، ذوقِ نیاز کو رُسوا

شبیہِ شاعر

سوزِ درون و برقِ نہاں کی جھلک سے رُخ

آئینہ دار ہے دلِ خانہ خراب کا

تصویر بھی بدلتی ہے کاغذ پہ کروٹیں

دُھندلا سا عکس ہے یہ مرے اضطراب کا

برسات

چڑھا ہوا ہے فضاؤں کو ایک نشّہ سا
شراب ناب میں ڈوبی ہوئی ہے ہر شے آج
اٹھی ہے درد کے مانند کالی کالی گھٹا
خبر نہیں مرا دل کیوں دھڑک رہا ہے آج

غزل

ہے نذرِ دل قبول، نگہ کامیاب ہے
ہوں وقفِ سوز و ساز کہ قسمت خراب ہے

آئینۂ نگاہ میں عکسِ شباب ہے
دنیا سمجھ رہی ہے کہ آنکھوں میں خواب ہے

روئے بغیر چارہ، نہ رونے کی تاب ہے
کیا چیز اُف یہ کیفیتِ اضطراب ہے

اے سوزِ جانگداز! ابھی میں جوان ہوں
اے دردِ لاعلاج! یہ عمرِ شباب ہے

منہ میں نہ ہو زبان تو اے دل میں کیا کروں

میری نگاہ تو نگہ کامیاب ہے

حد سے سوا ہو درد تو میں دل کو تھام لُوں
اس کا ہو کیا علاج کہ جینا عذاب ہے

یوں تو خدا نے دل کو دیئے ہیں ہزار درد
دردِ محبت آپ ہی اپنا جواب ہے

اختر کی آنکھ میں ہیں جوانی کی مستیاں
لوگوں کو ہے گماں کہ وہ مستِ شراب ہے

تاراجِ صبر

لُوٹ لے، رہزنِ مُغنّی! لُوٹ لے
دل ہے نذرِ نغمہ سنجی، لُوٹ لے
بچ رہی ہے دستبُردِ عشق سے
دولتِ صبر، آہ! یہ بھی لُوٹ لے

قطب مینار

ہاں دلِ شوریدہ حالم چشمِ عبرت باز کن
گردشِ ایّام را بنگر، الم را ساز کن
آہِ گرم و نالۂ جانسوز را طیّار شو
در فراقِ عزِّ ملّت دیدۂ خونبار شو
این منارہ را ببین، جورِ زمان اندازہ گیر
رفعتِ دیرینۂ اسلامیان اندازہ گیر
زین لوائے حق بپرس افسانۂ بزمِ کہن را
ہاں بکن سرشار زین خمخانہ جامِ خویشتن
شیون و آہ فغان را عظمتش محتاج نیست

وائے بر تو گر قرارت از الم تاراج نیست

اے منارِ قطبیہ! اے مسلمِ خستہ کی جاں
تجھ میں اب بھی رفعتِ ماضی کے باقی ہیں نشاں
تجھکو خلاقِ جہاں نے ذی شرف ایسا کیا
سارے عالم کا ترفّع تجھ میں ہے شوکت نما
اِس قدر اونچی فضاؤں تک ہے پہنچا تیرا سر
میری پروازِ تخیل کا نہیں واں تک گذر
آہ! تجھ پر سربلندی کا ہے کتنا سخت بار
اور اُس پر یہ متانت، یہ خموشی، یہ وقار
بزمِ عیشِ ماسبق کی تو ہے شمعِ مضمحل
تیرے استقلال سے ہوتا ہوں میں کیسا خجل

تیری پامالی میں صدیوں سے ہے کوشاں روزگار
آفریں صد آفریں تو آج تک ہے برقرار
آندھیاں آئیں، ہلایا زلزلوں نے بار بار
چوٹیں کھا کھا کر ہوئی تیری بنا اور استوار
برق کوکب ہے ترے در پر جبیں سائی نصیب
رعب سے تیرے لرز جاتی ہے آ آ کر قریب
ناصیہ فرسا ہے تیرے سنگ در پر آفتاب
یا شعاعوں کی ترے رخ پر ہے اک زریں نقاب
کیسا عبرت خیز ہے اس خاک پر تیرا وجود
تو رہے گا، عالم امکاں کی ہے جب تک نمود
تجھ میں ہیں آباد تہذیب کہن کے آشیاں

تُو ہے وہ سروِ سہی آتی نہیں جس کو خزاں
دولتِ قطبی و شمسی کی بسی ہے تجھ میں بُو
ملّتِ بیضا کی عظمت کا پتہ دیتا ہے تُو
اگلی سطوت اور ہیبت جو ہوا اب خواب و خیال
تیرے ہر ذرّہ میں ہے جلوہ نما اُس کا جلال
یادگارِ عظمتِ پیشینیاں ہے تو مدام
تیری ہستی سے جہاں آباد کا زندہ ہے نام
تیرا بانی ہے کوئی شاپد مئے وحدت پرست
ہوتے ہیں سیراب تجھ سے تشنہ کامانِ الست
ہند میں جن سے ہوئے وحدت کے دریا موجزن
تیرے قدموں میں پڑے سوتے ہیں وہ پہنے کفن

مرنے والے اپنی عظمت تجھ میں پنہاں کر گئے
مُسلمِ مہجور کی فرقت کا درماں کر گئے
جن کی قبریں تر ہمارے دیدۂ پُرنم سے ہیں
نام لیوا تیرے بھی ہم اِک انہی کے دم سے ہیں
گر زمانے نے مٹایا اُن کو، اِسکا غم نہیں
خود تری ہستی تسلی کے لئے کچھ کم نہیں
ختم کُن اے خامۂ درد آفرینِ اختری
تا کجا فریاد و زاری تا بہ کَے نوحہ گری

داغوں کی بہار

رنگ لا کر ہی رہی سوزشِ پیہم آخر
یعنی سُنتا ہوں کہ دل مرکزِ رعنائی ہے

کثرتِ داغ سے گلزار بنا ہی سینہ
اُجڑے گلشن میں، خدا رکھے، بہار آئی ہے

عالمِ اضطراب میں

بات کیا ہے، کیوں کلیجہ مُنہ کو آتا ہے مرا؟
کس لیے شیرازۂ دل بکھرا جاتا ہے مرا؟
کیوں پھٹا جاتا ہے سینہ، جی بھر آتا ہے کیوں؟
آہ! دریائے الم اُمڈا چلا آتا ہے کیوں؟
درد کیوں رہ رہ کے اُٹھتا ہے جگر میں اے خدا؟
گریہ ساماں کیوں ہوئی جاتی ہیں آنکھیں اے خدا؟
ہائے کیوں جی چاہتا ہے خُوب رونے کیلئے؟
داغہائے دل بنے جاتے ہیں کیوں جلتے دئیے؟

کیوں ہوا جاتا ہے باطل ضبطِ گریہ کا فسوں؟
درد کے ہاتھوں لٹا جاتا ہے کیوں دل کا سکوں؟
مژدہ اے مغموم! غم کی انتہا ہونے کو ہے
یہ مرض حد سے گذر کر اب دوا ہونے کو ہے

بہار

یہ بوندیاں، یہ ہوائیں، یہ کیف بارِ سماں
مرے حواس پہ اک بیخودی سی چھائی ہے
تجلّیاتِ مسرّت سے قلب ہے معمور
مگر بہار کسی کا سلام لائی ہے

مآلِ سوز

شمعِ مُردہ! شعلہ ساماں تھی کبھی تیری جبیں
ہاں جنونِ عشق کی سوتیں اُبلتی تھیں یہیں
عشق میں بے صبر ہونے کا ذرا انجام دیکھ
پاس تیرے آ کے پروانہ پھڑکتا بھی نہیں

آنکھیں

زمانے بھر سے کہہ دیتی ہیں دل کی داستاں آنکھیں
مجھے بدنام کرتی ہیں مری افسانہ خواں آنکھیں

نگاہوں میں سمٹ آئی ہیں سب بیتابیاں دل کی
خدا رکھے، ہوئی ہیں واقفِ رازِ نہاں آنکھیں

ابھی تو دل کی وحشت ہی جھلکتی ہے نگاہوں میں
کسی دن خون روئیں گی یہ دل کی رازداں آنکھیں

جگر کا خون کھنچ آیا ہے آنکھوں میں، مجھے ڈر ہے
نہ کر دیں رازِ دل کو آہ رسوائے جہاں آنکھیں

اگر اشکوں سے بھی کوئی نہ سمجھے مدّعا ان کا
تو اس سے آگے ہیں مجبور میری بے زباں آنکھیں

نغمہ اور محبّت

آہی اس کو محبّت سے کچھ تعلق ہے؟
جو اس طرح سے ستاتا ہے نغمۂ رنگیں
جہاں رباب کی آواز کان میں آئی
کسی کی یاد نے سینے میں بجلیاں بھر دیں

برخیز

لیلیٰ گذر چکی ہے او ہاتھ ملنے والے!
محمل کی گرد کو ہی اب رہنما بنا لے
کر ذوقِ قیس پیدا، ہو جا نثارِ محمل
خود اپنا راہبر ہو بنکر غبارِ منزل
ساحل کی قید کیسی، گرداب میں رواں ہو
طوفان کی موج بن جا اور شورشوں کی جاں ہو
خاموش آنسوؤں سے ہوگا نہ کچھ بھی حاصل
کُنجِ نہاں میں رہ کر پائی ہے کسنے منزل
شیون کی طرز میں ہے ایجاد کی ضرورت

شورِ نشور بھی فریاد کی ضرورت

او دردوغم کے مارے! شکوہ طراز بن جا!

ہو ہمصفیرِ بلبل، نالوں کا ساز بن جا!

غزل سرائی

جب مرے اشعار گاتا ہے کوئی

ڈبڈبا آتے ہیں آنسو آنکھ میں

اپنے غم کی داستاں سنتا ہوں

یاد آجاتی ہیں اگلی صحبتیں

موسمِ بہار

رموزِ قلب رقم ہیں بہار کے رُخ پر
جو نقش ہے اثرِ خامۂ محبت ہے
تجھے بھی علم ہے اے موسمِ بہار کہ تُو
کسی کے نام مرا نامۂ محبت ہے

برسات کے مناظر

سرمگیں بادل اُمنڈ کر آسماں پر چھا گئے
یعنی اعلاں ہو گیا "برسات کے دن آ گئے"
گلستاں کے منظروں کو چہچہانا آ گیا
مرغزاروں کو ہوا میں لہلہانا آ گیا
کھل کھلاتی آبشاریں اور اُبلتی ندّیاں
جنگلوں سے آ رہی ہیں کارواں در کارواں
دشت اور میداں ہرے ہیں وادیاں شاداب ہیں
جاری ہیں فوّارے ہر سُو، موجزن تالاب ہیں
مخملیں روئیدگی سے ڈھک گئے ہیں کوہسار

ہر طرف ہے خوشنما دھانی درختوں کی قطار
ننھی ننھی کونپلوں سے لد گئی ہیں ڈالیاں
جھومتی ہیں دلفریب انداز سے ہریالیاں
لالہ و گل سے بھری ہیں مالنوں کی جھولیاں
گا رہی ہیں رس بھری آواز میں ہمجولیاں
کھیلتی ہیں باغ میں پھولوں سے پھولوں والیاں
جابجا جھولے پڑے ہیں، خوش ہیں جھولوں والیاں
پٹ گئی ہے نقرئی پھولوں سے باغوں کی زمیں
بھینی بھینی نکہتوں سے ہے ہوا بھی عنبریں
موتیا کی تیز لپٹیں اور جوہی کی مہک
مست کرنے والی بیلے اور چنبیلی کی مہک

اِن کی بن آئی ہے اُڑتے ہیں قطاریں باندھ کر
اب تو لاتے ہیں پرندے آسمانوں کی خبر
گونج اُٹھا ہے پرندوں کی چہک سے آسماں
آرہی ہیں کان میں کیا کیا سُریلی بولیاں
وہ پھدکتی ننھی چڑیوں کے سحر زا چہچہے
یا فضا میں آسمانی دیویوں کے قہقہے
کوئی دیکھے اِن کے سینوں میں اُمنگوں کی بہار
پھولتی پھلتی تمنّاؤں، ترنگوں کی بہار
آہ! وہ سنسان راتوں میں گھٹاؤں کا ہجوم
ہلکی ہلکی اور متوالی ہواؤں کا ہجوم
اِس خُمار آگیں سمے میں گاہ جگنو کی چمک

٦٦

بادلوں کی چلمنوں میں گاہ تاروں کی دمک
بادلوں کا رات میں کھل کر برسنا دیکھ لو!
دیکھنے والو! پڑے گا پھر ترسنا، دیکھ لو!

دار و گیرِ ضبط

سارے دن خورشید کے جلوے رہیں
شب کو ہوں انجم کی بزم آرائیاں
آہ! داغِ دل مرے ترسا کریں
قید میں حاصل نہیں رعنائیاں

سحرِ نغمہ

شبِ سیاہ، خموشی، تلاطمِ انجم
فضا میں نالہ کناں ہے مغنّیہ کی صدا
عیاں ہے کیفیتِ کائنات تو لیکن
جو میرے دل پہ گذرتی ہے کہہ نہیں سکتا

غزل

شبِ مہتاب میں فطرت حسیں معلوم ہوتی ہے
خموشی اک سرودِ دلنشیں معلوم ہوتی ہے

یہاں کے گوشے گوشے سے برستی ہے مئی عشرت
تصوّر کی فضا خُلدِ بریں معلوم ہوتی ہے

طبیعت کا تلوّن کارفرما ہے جو یہ دنیا
کبھی دلکش کبھی ستم آفریں معلوم ہوتی ہے

مرا سینہ دفینہ ہے محبّت کے خزانوں کا
مجھے کونین کی دولت یہیں معلوم ہوتی ہے

فناؔ نے درد کے شاعر سُنا دیتا ہے گاگا کر

یہ ہستی رازِ ہستی کی امیں معلوم ہوتی ہے
شرابِ ناب کی غارت گریٔ ہوش، ارے توبہ
زمیں بھی مائلِ عرشِ بریں معلوم ہوتی ہے
مرے سینے میں اختر چھپا تا ہے کوئی بلبل
فضائے دل ترنّم آفریں معلوم ہوتی ہے

دل کی ہُوک

نشۂ خواب میں مدہوش ہے ساری دنیا
ہر طرف چھا گئے ہیں ظلمتِ شب کے پردے
رات ویران ہے اور میں یہ دعا کرتا ہوں
مرے دل میں جو خلا ہے اُسے کوئی بھر دے

سیرِ کوہسار

آج پھر میری اُمنگوں میں ہوا ہیجان بپا
ہو گئی میری طبیعت پھر تلاطم آشنا
نیند سے سوئی پڑی تھیں جو تمنائیں مری
جاگ اُٹھیں یک بیک انگڑائیاں لیتی ہوئی
پھر اُسی ذوقِ نظر سے دل مرا بے چین ہے
پستیوں میں جس کی پنہاں رفعتِ کونین ہے
یہ ترا کیف آفریں جوشِ فراواں اے بہار
یہ ہجومِ سبزہ و گُل، یہ ہوائے فرح بار
یہ تری رعنائیاں کہسار کی آغوش میں

اب دلِ شوریدہ کا مشکل ہے رہنا ہوش میں
ہر طرف حدِّ نظر تک اک صفِ کہسار ہے
دُور، اُونچی چوٹیوں پر برف کا انبار ہے
کوہ پر شبنم کا ہر قطرہ دُرِ نایاب ہے
اور دُرِ نایاب میں محفوظ اک مہتاب ہے
آبشاروں کا نظارہ کیفیت انگیز ہے
قطرہ قطرہ میکدہ، ہر موج بادہ ریز ہے
ابر کے ٹکڑوں کا وہ اُٹھنا نشیبوں سے کبھی
اور چھا جانا فضاؤں پر بہ رنگِ خامشی
آسماں پر مہرِ عشوہ ساز کی اٹکھیلیاں
جھانکنا وہ ابر میں سے اور ہو جانا نہاں

جا بجا ہیں پھول اور سربستہ کلیاں جلوہ گر
یا مگر بیٹھے ہیں مل کر حور و غلماں ہمدگر

مست کلیوں کا تبسّم عکسِ حُسنِ ذات ہے
رقص کی تحریک ہے، برہم زنِ جذبات ہے

پھول کی رنگیں کشش سے یوں کھنچا جاتا ہے دل
مائلِ رفعت ہو جیسے کوئی روحِ منفعل

برگِ گل میں جان ڈالی ہے شمیمِ باغ نے
روح پھونکی ہے درختوں میں نسیمِ باغ نے

جھومتی ہیں ایک مستانہ ادا سے ڈالیاں
جھولتی ہیں یا اُمنگوں میں بھری متوالیاں

ڈالیوں پر جب ترنّم ریز ہوتے ہیں طیور

کان میں پڑتا ہے رس، دل میں برستا ہے سرور
ہے زمیں گونجی ہوئی اور آسماں گونجا ہوا

نغمۂ مرغاں سے ہے سارا جہاں گونجا ہوا
ہر شگوفے کی چٹک اک نغمۂ ہنگامہ ساز

شاخِ گل پر بلبلِ شوریدہ مصروفِ نیاز
نالۂ جانسوزِ بلبل کا وہ آنا جوش میں

درد بن کر پھر سما جانا دلِ مدہوش میں
کلکِ نقاشِ ازل کے نقش یعنی تتلیاں

چوستی پھرتی ہیں رس پھولوں کا ہو کر شادماں
یا مگر کچھ شوخ پریاں تتلیوں کے بھیس میں

آ گئی ہیں سیر کرنے آدمی کے دیس میں

دیدہ و دل دونوں حیران ہیں کہ یارب کیا ہے یہ
منظرِ کہسار ہے یا حُسن کی دنیا ہے یہ
یہ مناظر کی دلآویزی، یہ کیفِ صبح و شام
فطرتِ معصوم کی ہے کارفرمائی تمام
آہ! وہ آبِ رواں پھرتا ہے جو کھویا ہُوا
جس کی ہر جنبش میں ہے اک درد سا سویا ہُوا
روحِ مضطر جس کے قالب کا ہے اک نقشِ رواں
ہیں نہاں سینے میں جس کے مرتعش کچھ بجلیاں
باعثِ دیوانگی ہے جس کی ہر رنگیں ادا
گونجتی ہے جس کی خاموشی میں بامعنی صدا
پستیوں میں خاک کی اور رفعتوں میں کوہ کی

لوٹتا پھرتا ہے جو با حالتِ درماندگی
انعکاسِ نونہالانِ چمن سے کھیلتا
فطرتِ رعنا کی تصویروں کا روشن آئنہ
یہ عروسانِ بہاری، یہ نقوشِ جاں نواز
یہ نشاط آور سماں، یہ عالمِ کیف و گداز
دل لبھانے کے ہیں ساماں، غم کے شعلے بھی مگر
میرے سینے میں بھڑک اٹھتے ہیں اِن کو دیکھ کر
آہ اے منظر کہ بہجت خیز ہے سب کے لئے
تو بھی سامانِ اذیّت ہو گیا میرے لئے
ایک عالم ہو غریقِ رنگ و بوئے کوہسار
اور افکارِ پریشاں میں رہوں میں بے قرار

گذشتہ شب

ہوا تھی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی تھی اور دریا تھا
کہیں نزدیک ہی جنگل میں کوئی گیت گاتا تھا
فضا میں رس بھرے نغموں کی ہلکی ہلکی بارش تھی
مرے دامن میں چھم چھم آنسوؤں کا مینہ برستا تھا

ھلالِ عید

فریب خوردہ ہماری طرح نہیں کوئی
نہ ہوگا ہم سا خرابِ وفا کہیں کوئی
سرابِ دہر کی زرکاریوں نے لُوٹ لیا
ہمیں زمانے کی عیّاریوں نے لُوٹ لیا
شکوہ وجاہ، زر وبخت، دولت و اقبال
دیا نہ ساتھ کسی نے، جلال ہو کہ جمال
عروسِ تیغ و علم سے نباہ ہو نہ سکا
کہ تخت و تاجِ جہاں اہلِ شاہ ہو نہ سکا
بہارِ علم و ہنر نے کہاں فراغ دیا؟

ہماری گود میں پلکر ہمیں کو داغ دیا
یہ انقلاب! کہ بیگانہ ہو گئے اپنے
نصیب ہی، یہ ستم ہے، کہ سو گئے اپنے
خدا نے پھیر لیں آنکھیں، وفا کہیں نہ رہی
فلک فلک نہ رہا اور زمیں زمیں نہ رہی
ہلالِ عید، پرانی روش پہ قائم ہے
وفا شعار ہے یہ، اِس کا لطف دائم ہے
مزا شرابِ کہن کا چکھا ہی جاتی ہے
ہم اہل ہوں کہ نہ ہوں عید آ ہی جاتی ہے

صدائے بازگشت

لہو رونے والے! الم دوست شاعر!
ذرا واقفیت تجھے کاش ہوتی
رلاتی ہے جو بیقراری تجھے یوں
وہ ہے گونج ایک اور دل کی تڑپ کی

غزل

جو داغ بن کے تمنّا تمام ہو جائے

ہمیں تو خون بھی رونا حرام ہو جائے

مٹایا خود کو، کسی پر نہیں کیا احسان

یہ اور بات ہے حاصل دوام ہو جائے

یہی ہے مصلحت اخفائے راز میں اخترؔ

جہاں میں رسمِ محبّت نہ عام ہو جائے

مُغنّیہ کی آواز

یہ ترنّم ، یہ لطافت اور یہ رنگینیاں
کیوں نہ صدقے جائیے اِس سحر کار آواز کے
جانفزائی ، قلب سوزی ، دلفریبی ، رہزنی
واہ ! کیا انداز ہیں اِس خانہ بر انداز کے

اُمنگ

بہارِ خُلد کا سپنے میں بول بالا ہے
تری ضیا سے مری روح میں اُجالا ہے
شعاعِ نُور سے آنکھوں میں ہے چمک پیدا
ترے جمال کے پرتو سے ہے دمک پیدا
فروغِ رنگ سے رعنائیوں کا عالم ہے
مرے دماغ میں انگڑائیوں کا عالم ہے
اُبل رہا ہے نشاط و سُرور کا دریا
رواں جگر سے نظر تک ہے نُور کا دریا
تو ایک شمع ہے جو دل میں دے رہی ہے لَو
بنا رہی ہے چراغاں جہاں کو تیری ضَو

مری نگاہ میں ہے رشکِ طُور ہر ذرّہ
ترے جمال کا دراصل عکس ہے دنیا
فضا میں موجِ صبا بن کے کھیلتی ہے تُو
شرابِ حسن کے ساغر انڈیلتی ہے تُو
شبابِ حسنِ بہاراں میں رنگ تیرا ہے
گلوں کی مست اداؤں میں ڈھنگ تیرا ہے
بہارِ زیست کو تجھ سے ثبات حاصل ہے
ترے وجود سے دل کو حیات حاصل ہے
مئے نشاط کا تُو ایک جام ہے گویا
مجھے حیاتِ ابد کا پیام ہے گویا

متفرق اشعار

جو سچ پوچھو تو دنیا میں فقط رونا ہی رونا ہے
جسے ہم زندگی کہتے ہیں کانٹوں کا بچھونا ہے

طبیعت معنوی آلام سے غافل نہیں ہوتی
جسے سچی خوشی کہتے ہیں وہ حاصل نہیں ہوتی

جفائے پیہم نے آرزو کو تھپک تھپک کر سُلا دیا ہے
نگاہِ لطف و کرم الٰہی کہیں یہ دوبارہ بیدار ہو نہ جائے

اِس درد کو سہہ تو لوں، یہ کیسی مصیبت ہی
جو مجھ پہ ستم ڈھائے اُس کو ہی نہ ہو معلوم

دل اپنے سوز و ساز کو پہچانتا تو ہے
نغمہ سے کہہ رہا ہے مری داستاں ہے تو

کیا ہوا اللہ! کیوں یہ بہتے آنسو تھم گئے
ہو گیا محتاج دل کیا اک لہو کی بوند کا

وہ راز کہ اغیار سے کہہ بھی نہیں سکتے
سینے میں بھی اللہ چھپایا نہیں جاتا

ہمیشہ وقتِ سحر جب قریب ہوتا ہے
کسی کی یاد میں اک نامراد روتا ہے

مٹ گئے ایک غمِ عشق میں جھگڑے سارے
درد سمجھے تھے جسے ہم وہ مداوا نکلا